بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟

برادران عزیز!

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں ابھرتا اور دلوں کو پریشان کرتا ہے' یہ ہے کہ عام اخلاقی اقدار تمام مذاہب (بالخصوص بڑے بڑے مذاہب) میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ سب مذاہب یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ دیانت دار بنو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دین برحق صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی اور دین قابل قبول نہیں۔ نوع انسان کی نجات و سعادت اسی سے وابستہ ہے' اس لئے تمام اہل مذاہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

اہم سوال اگر وہ خصوصیت جن کی بنا پر اسلام کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے' یہی اخلاقی اقدار ہیں' تو پھر یہ حق ہر ایک مذہب کو پہنچنا چاہئے۔ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ جن خصوصیات کی بناء پر ہم اسلام کو دین الحق قرار دیں' انہی کے مطابق جب دوسرے مذاہب اپنے متعلق اسی قسم کا دعویٰ کریں تو ہم ان کے دعویٰ کو باطل قرار دے دیں اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں!

برہمو سماجی مذہب یہ سوال واقعی اہم ہے اور' جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' یہ اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا اور قلوب کو پریشان کرتا ہے۔ یہی وہ سوال

ہے جو اس سے پہلے علمی دنیا میں اس وقت سامنے آیا جب مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ اعلان درحقیقت صدائے بازگشت تھی برہمو سماجی تحریک کی جو اس سے پہلے بنگال میں اٹھی تھی۔ انہوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب کی (مبینہ) آسمانی کتابوں سے (بزعم خویش) اچھی اچھی باتوں کو یکجا کر کے ایک مجموعہ تعلیم مرتب کیا اور اسے دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس تعلیم میں تمام مذاہب کی مشترکہ سچائیاں موجود ہیں' اس لئے مذہبی اختلافات مٹانے اور سچائی پر عمل پیرا ہونے کا یہی طریق ہے کہ تمام اہل مذاہب اس تعلیم پر ایمان لے آئیں اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں۔ یہ مشترکہ تعلیم انہی اخلاقی اقدار پر مشتمل تھی۔ برہمو سماجی تحریک سے بہت پہلے اکبر کے "دین الٰہی" کی بنیاد بھی اسی تصور پر تھی۔ اسی کا مبلغ داراشکوہ تھا جس کے تصوف کی رو سے "رام اور رحیم" میں کوئی فرق نہیں اور حقیقت کا جلوہ دیر و حرم میں یکساں موجود ہے۔ اسی کی صدائے بازگشت' بھگت کبیر اور سور داس کے بھجنوں اور شاہ فرید اور سلطان باہو کی کافیوں میں ہر گلی کوچے میں سنائی دیتی ہے۔

مذہب کی بھی ضرورت نہیں! اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر صداقت انہی اخلاقی اقدار کا نام ہے اور انہی پر عمل پیرا ہونا انسانی زندگی کا منتہی ہے تو اس کے لئے..... مذہب کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں۔ جو خدا کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بہت برا ہے۔ سچ بولنا چاہئے۔ دیانتدار بن کر جینا چاہئے۔ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے مذہب کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی وہ تصور تھا جس کی بنیادوں پر یورپ میں (Humanism) کی تحریک اٹھی اور اس نے (Revelation

(Religion without) "مذہب بلا وحی" کے دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر مذہب کا مقصود و منتہی یہی اخلاقی اقدار ہیں اور انسانی زندگی ان اقدار کو مان لینے سے اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے تو پھر (Humanism) کے دعویٰ کو کس طرح ٹھکرایا جا سکتا ہے؟۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہے اور اس کے اطمینان بخش جواب کا سامنے آنا کس قدر ضروری؟ اس اہمیت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق سنجیدگی سے (Seriously) سوچا جائے اور اسے انتہائی غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ **وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔**

دین کیا ہے؟ اس باب میں بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کو صرف ایک اخلاقی ضابطہ (Ethical Code) سمجھ لیا جاتا ہے' اور بس۔ دین' چند اخلاقی اقدار کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی (System of Life) ہے جو حیات انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اخلاقی اقدار اس نظام کے اندر بروئے کار آتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ یہ نظام' انسان کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جن پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے۔ بد دیانتی سخت معیوب ہے۔ فریب دہی بڑی مذموم حرکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بد دیانتی عام ہو رہی ہے۔ فریب دہی کی گرم بازاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انسان ان تمام باتوں کو برا کہنے کے باوجود' انہیں کیوں اختیار کئے ہوئے ہے؟ وہ ان حرکات کو انتہائی معیوب اور مذموم سمجھنے کے باوجود انہیں کیوں نہیں چھوڑتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ یا تو ان اخلاقی اقدار کا محض رسماً" اور تقلیداً" اقرار کرتے ہیں اور یا ان کی بنیاد محض جذبات پر ہوتی ہے۔ انہیں اس کا کچھ علم

نہیں کہ ان اقدار کو کیوں اختیار کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیوں نہ کی جائے۔ آپ کسی شخص سے کہئے کہ وہ آپ کو مطمئن کرے کہ آپ جھوٹ کیوں نہ بولیں۔ سطحی گفتگو سے ذرا نیچے اترنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہو گا۔ وہ دلیل و برہان سے آپ کی "کیوں" کا کچھ جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ آپ کو علیٰ وجہ البصیرت (Rationally) نہیں سمجھا سکے گا کہ جھوٹ بولنے سے آپ کا کیا نقصان ہو گا اور سچ بولنے سے آپ کا کیا فائدہ ہو گا اور چونکہ انسان اسی بات کو اختیار کرتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو اور اسی چیز کو چھوڑتا ہے جس میں اس کا نقصان ہو' اس لئے' اس کا یہ اقرار تو محض رسمی اور تقلیدی ہوتا ہے اور یا جذباتی عواطف کا پیدا کردہ۔ وہ نہ ان اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھتا ہے اور اس لئے نہ انہیں اپنی زندگی کا مسلک بناتا ہے۔

دین وہ بنیادی تصورات عطا کرتا ہے جن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصد اور منتہی نمایاں طور پر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مقصد زندگی' دنیا کی ہر شے کی صحیح صحیح قدر (Value) متعین کرتا ہے اور جب اقدار متعین ہو جائیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس بات میں میرا نفع ہے اور کس میں نقصان۔ کونسی قدر زیادہ قیمتی ہے اور کونسی کم۔

خواہش سے عمل تک

ان بنیادی تصورات کے ساتھ' دین وہ عملی نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ نظری اقدار' حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کے محسوس نتائج سے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کس قدر فائدہ ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر نقصان۔ اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر ہو کر اپنی کارفرمائی کے لئے صحیح راستہ (Channel) اختیار کر لیتے ہیں' اور چونکہ عمل کے لئے قوت متحرکہ انسانی جذبات ہیں' اس لئے اس کی زندگی ان بلند اقدار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی

ہے۔ یاد رکھئے۔ انسانی سعی و عمل تین مراحل میں سے گزرتی ہے۔ آپ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش (Desire) غیر شعوری طور پر دل میں بیدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی دلیل و برہان یا وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق خالص جذبات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اسے عقل کے سامنے لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جذبات شدید ہیں تو آپ کی عقل' اس خواہش کے بروئے کار لانے کے سامان سوچتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ انہیں (Justificatory Reasons) کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کی عقل' جذبات پر غالب ہوتی ہے تو وہ پھر نفع اور نقصان کا موازنہ کرتی ہے اور اگر دیکھتی ہے نفع کا پہلو زیادہ وزنی ہے تو اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب آپ کی خواہش (Desire) آپ کی مرضی (Wish) میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قوت ارادی آگے بڑھتی ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں آپ کی (Wish) ارادہ (Will) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لیکن عقل انسانی' اگر وہ جذبات کے تابع نہ بھی ہو' تو بھی زیادہ سے زیادہ اس شخص کے ذاتی نفع یا نقصان کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بالفاظ دیگر' انسانی عقل' فرد متعلقہ کو یہ بتا سکتی ہے کہ کونسی بات میں اس کا فائدہ ہے اور کون سی بات میں نقصان۔ وہ حق اور باطل (Good and Evil) میں تمیز نہیں کر سکتی۔ یہ تمیز صرف اقدار کے سامنے ہونے سے ہو سکتی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' اقدار کا تعین' تصور حیات کی رو سے ہوتا ہے۔

تصور حیات کا اثر تصور حیات (صحیح یا غلط) کس طرح انسانی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے اور اس کی سعی و عمل (Activities) کا رخ متعین کر دیتا ہے' اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آج ہر شخص کو شکایت ہے کہ دنیا میں جھوٹ۔ فریب۔ مکاری۔ دغا بازی۔ بددیانتی۔

رشوت ستانی- بے انصافی- ظلم استبداد- سلب و نہب (Exploitation) عام ہو رہے ہیں' ایسا نظر آتا ہے گویا ان خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں جن سے نہ کوئی خطہ زمین محفوظ رہا ہے اور نہ اس خطہ میں بسنے والا کوئی فرد ان سے مامون- آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بالاخر وجہ کیا ہے؟ برائیاں تو دنیا میں پہلے بھی تھیں لیکن وہ اس طرح عام اور ہمہ گیر نہیں تھیں- بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس کی وجہ وہ تصور حیات (Concept of Life) ہے جو انیسویں صدی میں سرزمین مغرب میں نمودار ہوا اور وسائل رسل و رسائل کے عام اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گیا- یہ تمام خرابیاں اس ایک تصور حیات کے برگ و بار ہیں- یہ تصور حیات یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور اس کی زندگی پر انہی قوانین و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے- جن کے مطابق باقی حیوانات جیتے اور مرتے ہیں- بقائے اصلح (Survival of The Fittest) فطرت کا اٹل قانون ہے- اس قانون کی رو سے' زندہ رہنے کا اسی کو حق ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لے- یہ قوت کس طریق سے فراہم کی جائے' اس کا کوئی سوال ہی نہیں- ضعیف اور کمزور' صرف طاقتوروں کی خوراک بننے کے لئے زندہ رکھے جا سکتے ہیں- ہر بڑی مچھلی' چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے- کیڑے مکوڑے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چڑیوں کی غذا کا کام دیں اور چڑیاں اس لئے جیتی ہیں کہ وہ عقاب کا شکار بنیں- یہی قانون فطرت ہے- یہی آئین حیات ہے- اسی سے افراد اور اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس' تقاضائے عدل ہے- جنگل کا بادشاہ شیر ہے- بکری نہیں- اگر شیر بکری کو کھا جاتا ہے تو اس سے بکری یہ شکایت نہیں کر سکتی کہ اس پر ظلم ہوتا ہے-

حیوانات کی زندگی' جبلی تقاضوں (Instincts) کے زور پر بسر ہوتی

ہے- یوں تو یہ تقاضے بہت سے ہیں' لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- جذبہ تحفظ خویش (Self-Preservation) جذبہ تغلب (Self-Assertion) اور جذبہ افزائش نسل (Self-Reproduction) جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر فرد' انہی جذبات کے تابع مصروف عمل رہے گا- اس میں اخلاقی اقدار کی گنجائش ہی نہیں ہو گی-

نیشنلزم اس تصور کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کی رو سے' بلند ترین کیریکٹر' نیشنل کیریکٹر قرار پائے گا- غور سے دیکھئے تو نیشنل کیریکٹر بھی حیوانی جذبہ (Animal Instict) ہی کا پیدا کردہ ہے (Herd Instinct) حیوانات کی جبلت میں ہے- ہر حیوان اپنی حفاظت اسی میں دیکھتا ہے کہ وہ گلہ کے ساتھ رہے- یہی وہ جذبہ ہے جس سے آج کل نیشن وجود میں آتی ہے اور قائم رہتی ہے- اپنی قوم کی بہبودی اور خوش حالی' افراد کے نزدیک بلند ترین قدر قرار پاتی ہے سب سے بڑا محب وطن وہ ہے جو دوسری اقوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اس کی رنگینی سے اپنی قوم کے قصر بلند کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائے- اس کے لئے دیانت اور بد دیانتی- جھوٹ اور سچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا- جو شخص ان اقدار کا خیال کرنے بیٹھ جائے وہ امور مملکت کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا- (Walpole) کے الفاظ میں

> نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے- اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے' نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے-

اس ضمن میں ان محبان وطن (Patriots) کو جو کچھ کرنا پڑتا ہے' اس کے متعلق اٹلی کے مشہور مدبر (Cavour) کے یہ چند الفاظ دہرا دینے کافی ہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم مملکت کے لئے کرتے ہیں تو کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک تصور حیات کے بدل جانے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے اور اس تصور حیات کا اثر کس طرح اس کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو متاثر کر دیتا ہے؟ یہ جو ابھی تک اخلاقی اقدار کی زبانی تعریف ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تحت الشعور کو اتنی جلدی ماضی کے اثرات سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ اگر یہ تصور حیات دو چار نسلوں تک اور آگے بڑھا تو اس کے ذہن سے ان اقدار کا تصور تک مٹ جائے گا اور پھر ان کا زبانی اعتراف بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری ابھرنے والی نسل ان اقدار کو دقیانوسیت قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتی ہے۔

اسلام وہ تصورات دیتا ہے جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کا ہر گوشہ بلند انسانی اقدار کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ تصورات' لا مذہبیت میں تو ایک طرف' دنیا کے کسی مذہب میں بھی نہیں ملتے۔ یہی اسلام کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بناء پر وہی اور صرف وہی دین الحق قرار پاتا اور انسانی فوزو فلاح کا ضامن بنتا ہے۔ اصولی طور پر یہ تصورات' حسب ذیل عنوانات سے متعلق ہیں۔

(1) خدا کا تصور
(2) خدا اور انسان کا تعلق
(3) انسان اور کائنات کا تعلق
(4) انسان اور انسان کا باہمی تعلق
(5) اعمال اور ان کے نتائج کا تعلق
(6) زندگی کے منتہی و مقصود کا تصور

آئندہ صفحات میں انہی تصورات کے متعلق مختصر الفاظ میں بحث کی

جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دیگر بڑے بڑے مذاہب (ہندومت۔ یہودیت۔ عیسائیت) میں یہ تصورات کس قسم کے ہیں اور قرآن کس قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور ان تصورات کی رو سے انسانی زندگی کا نقشہ کس قسم کا مرتب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرے پیش نظر' مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (Comparative Study of Religions) نہیں۔ ان مذاہب میں' ان تصورات کے متعلق جو بنیادی عقائد ملتے ہیں' میں صرف انہی پر اکتفا کروں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے اپنے اپنے وقت میں' صحیح اور سچی تعلیم ملتی رہی تھی لیکن اہل مذاہب کی مروجہ آسمانی کتابوں میں وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اس لئے ان تصورات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم پر مبنی ہو گا۔ ان کی اس اصلی اور حقیقی تعلیم پر نہیں جو اس وقت ان میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب 'معراج انسانیت' کے پہلے باب میں ملے گی جس میں' خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیقات کے مطابق یہ بتایا گیا ہے کہ ان مذاہب کی اصلی تعلیم ان کے ہاں کہیں باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ یہ حضرات اپنی موجودہ تعلیم کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں اس لئے ان تصورات کے متعلق ان کی اسی تعلیم کو سامنے لایا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی۔

---

(1) خدا کا تصور

ہندومت میں خدا کا تصور ان ہر سہ مذاہب (ہندو مت۔ یہودیت اور عیسائیت) میں ہندو دھرم کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس کی قدامت کا ثبوت ان کی مروجہ مذہبی کتابیں بہم پہنچا رہی ہیں جن کا ایک ایک ورق اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اس زمانے کی

تصنیف ہیں جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ بچپن کا ذہن' کسی مجرد حقیقت (Abstract Reality) کا تصور' محسوس پیکروں سے الگ ہٹ کر' کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس زمانے کا انسانی ذہن' خدا کی ذات کے متعلق منزہ تصور کیسے قائم کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کو اپنی شکل پر ڈھالا اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے (مثلاً) دو ہاتھ ہیں تو خدا کے آٹھ ہاتھ سمجھ لئے۔ انسان کا ایک سر ہے' خدا کے دس سر تصور کر لئے۔ انسان پیالہ پانی پی سکتا ہے' خدا پورا سمندر اپنے اندر انڈیل سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تین بنیادی خدا مانے جاتے ہیں۔ برہما۔ شوجی اور وشنو۔ ان کی بیویاں بھی ہیں اور بچے بھی۔ شیو جی کی بیوی پار بتی اور ان کا بیٹا گنیش' جس کا جسم انسان کا اور سر ہاتھی کا ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی۔ پہلے ان تینوں خداؤں کی پرستش ہوتی تھی لیکن اب برہما کی پرستش نہیں ہوتی۔ پرانوں میں ہے کہ ایک دفعہ شو جی نے دیکھا کہ برہما اپنی لڑکی سرسوتی سے فعل شنیع کا مرتکب ہونا چاہتا ہے اس لئے اس نے اس کی پرستش بند کر دی۔

(ہندو ازم صفحہ 184 مصنفہ گووند داس)

تخلیق کائنات کے متعلق' شوپران میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

> شو جی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کروں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چلو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بلبلا اٹھا۔ بلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا کہ "اے بیٹے دنیا کو بنا"۔ برہما نے کہا "میں تیرا بیٹا نہیں۔ تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہا دیو (شو جی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا وہ فوراً آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے۔
>
> اس کے بعد سنئے کیا ہوا

دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہئے۔ جو پہلے آئے وہ باپ جو پیچھے آئے وہ بیٹا کہلائے۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا۔ برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا اگر وشنو پتہ لے آیا ہو گا تو مجھے اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اترا۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلتے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔

برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر اس کی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ گواہی نہیں دو گے تو میں تمہیں ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہو ویسی ہی گواہی دے دیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے پوچھا کہ تم نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بددعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھائے گا اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گائے کو بددعا دی کہ جس منہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے اس منہ سے تو پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دم کی کریں گے۔ برہما کو بدعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہو گی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے اس لئے تیری پرستش سب

جگہ ہو گی- پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی-

اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا- تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے- تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک راکھ کا گولا نکالا اور کہا- جا کر اس سے خلقت پیدا کرو-

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش- سوامی دیانند- صفحہ (272-273))

خدا کا تصور وہ بلند ترین آئیڈیل ہوتا ہے جسے کوئی قوم اپنی سامنے رکھتی ہے- اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے خدا کا یہ تصور ہو اس کے اعمال حیات کس قسم کے ہو سکتے ہیں- نہ اس قوم کا ذہن توہم پرستی سے نجات حاصل کر سکتا ہے' نہ ان کے اعمال کا مدار علم و بصیرت قرار پا سکتا ہے- وہ جس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ بھی انسانی پیکر سے بلند نہیں ہوتا- چنانچہ اتھروید میں ہے کہ خدا کی پوجا پاٹ کے وقت یہ کہنا چاہئے کہ

اے جیئوں کے سوامی پرماتما ! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار (سجدہ) ہے- تیری آنکھوں کو نمسکار ہے- تیری چمڑی کو نمسکار ہے- تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے- تیرے پیٹ کو نمسکار ہے- تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے- تیرے مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے- تیرے دانتوں کو نمسکار ہے- تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو نمسکار ہے-

یہودیوں کے ہاں خدا کا تصور

ہندو مت کے بعد' اب یہودیت کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے- غالباً لاک (Locke) نے کہا تھا کہ تم مجھے بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا تھا اور میں یہ بتا دوں گا کہ اس قوم کی تہذیب اور اس کا تمدن کس قسم کا تھا- مروجہ تورات کے مطالعہ سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے' اس کے متعلق ایک مغربی محقق کا پیش کردہ جائزہ سامنے لے آنا کافی ہو گا- (Joseph Whebs) اپنی کتاب (Is It God's

(Words میں لکھتا ہے۔

تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور' غدار' انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت' گنہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر۔ شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔ (بحوالہ معراج انسانیت صفحہ 22)

تورات میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی اس قسم کی شکل ہو' اس کی پیدا کردہ قوم کی شکل بھی ایسی ہی ہو گی۔ یہ خدا کی شکل نہیں بلکہ اس قوم کی اپنی سیرت کا بیان ہے۔ خدا کے اس قسم کے تصور کے بعد' اخلاقی اقدار کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کے لئے کسی صراحت اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔

عیسائیت میں خدا کا تصور یہودیت سے آگے بڑھ کر عیسائیت کی طرف آیئے تو وہاں خدا کے تصور کی چیستاں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کونسل اوف ٹرنٹ نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کے لئے جو نظریہ تجویز کیا تھا اور جس کے اقرار سے ایک شخص عیسائی بنتا ہے' حسب ذیل ہے۔

ہم ایمان لائے (1) خدا' قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے۔ اور ہم ایمان لائے (2) رب یسوع ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ یعنی خدا کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ عین خدا ہے۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئی ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول وحلول ہوا۔ وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے مصیبت ہوا۔ اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آسمان پر چڑھا۔ اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے کے

لئے پھر دنیا میں آئے گا۔

یہ تو رہا حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ۔ ان کی والدہ ماجدہ' حضرت مریمؑ کے متعلق مقدس کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ

> وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمہ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے' اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی..... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔
>
> (بحوالہ شعلہ مستور صفحہ 129 (Catholic School Book. P.158)

چنانچہ اب حال ہی میں' پوپ کی مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ باپ۔ بیٹا اور روح القدس کے ساتھ حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جایا کرے۔

قرآن کا دیا ہوا تصور خدا کے ان تصورات کے بعد اب قرآن کریم کی طرف آیئے۔ اس نے سب سے پہلے ان تمام تصورات کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (23/92)۔ یہ لوگ خدا کے متعلق جو تصورات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں' وہ ان سے بلند اور پاک ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ تم انہی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہو جو محسوسات کے دائرے میں آسکیں اور خدا کی ذات اس سے ماوراء ہے۔ لہٰذا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (6/104)۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ بہت لطیف و خبیر ہے۔ اس کی ذات کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (42/11)۔ اس کی مثل

کوئی شے نہیں۔ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ (112/3)- نہ وہ خود کسی کا بیٹا۔ نہ کوئی اس کا بیٹا۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ (112/4)- نہ کوئی اس کا ہمسر۔ وہ یکسر یگانہ اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

اس کی ذات کے متعلق تو تم کچھ نہیں جان سکتے۔ البتہ اس نے جو اپنی صفات بیان کی ہیں ان سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بلند' پاکیزہ' باعظمت اور حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

(2) خدا اور انسان کا تعلق

سوال یہ ہے کہ خدا کی ان صفات پر ایمان لانے سے فائدہ کیا ہے۔ ایک شخص تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی یہ صفات ہیں۔ دوسرا اس سے انکار کرتا ہے۔ اس اقرار اور اس انکار سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی پیکر "روح خداوندی" کا حامل ہے۔ جسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات میں اس کا امکان رکھ دیا گیا ہے کہ وہ (علیٰ حد بشریت) ان خدائی صفات کو اپنے اندر اجاگر کرتی جائے۔ یہی وہ خدا کا رنگ ہے جس سے حسین تر رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (2/138)- اس اعتبار سے' خدا کی یہ صفات' انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک خارجی معیار (Objective Standard) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ وہ (Ideal) ہے جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس پر وہ پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خارجی معیار پر ہر آن اپنے آپ کو ماپتا جاتا ہے اور اس طرح علیٰ وجہ البصیرت پرکھتا جاتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما (Development) ہوئی ہے۔ اور اس میں ہنوز کیا کمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ کس موقع پر خدا کی کونسی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ ایسے موقع پر انسان کی طرف سے بھی اسی قسم

کی صفت کا ظہور ہو۔ اس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ خارجی واقعات و حوادث پر انسان کا ردعمل کیا ہونا چاہئے۔ یاد رکھئے۔ جس طرح انسان کے لئے صفات حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی واقعہ پر انسان کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو جو اس کے لئے مناسب اور موزوں (Appropriate) ہو۔ شقی القلب ظالم پر' جس کے دل میں نہ احساس ندامت ہو نہ آرزوئے اصلاح' ترس کھا کر اسے کھلا چھوڑ دینا' مظلوم انسانوں پر بے انتہا ظلم ہے۔ لیکن جہاں عفو اور درگذر سے خوشگوار نتائج متوقع ہوں وہاں بدلہ لینا ظلم کے مرادف ہو جاتا ہے۔ عضلات (Muscles) کی چوٹ آہستہ آہستہ مالش سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو سخت لکڑی کی تختیوں (Splints) سے کس کر باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے جباریت کہتے ہیں (جراح کی ان لکڑیوں کو جبائر کہتے ہیں) قرآن کریم ان صفات خداوندی اور ان کے مواقع ظہور و اطلاق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ جہاں ایک فرد کی ذات کی نشوونما کا معیار بنیں' وہاں یہ بھی بتائیں کہ انسان کی طرف سے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل ہونا چاہئے۔

قانون کا خدا اسی سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک مستبد بادشاہ (Autocrate King) اور مطلق العنان آمر (Dictator) کا ہوتا ہے' جس کے تمام فیصلے اس کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں اور ان میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہو گیا تو مجرم کو خلعت بخش دی۔ ناراض ہو گیا تو بے گناہ کو حوالہ دار و رسن کر دیا۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ جس طرح ہو سکے اس "خدا" کو خوش رکھے۔ وہ اس کی خوشنودئ مزاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اس کے حضور نذرانے گزارتا ہے۔ اس کے مقربین کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ ان احکام کی فرماں برداری سے انسان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود صرف "خدا" کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری

طرف' عیسائیت ہے۔ جہاں خدا کا تصور ایک رقیق القلب باپ کا ہے' وہاں بھی قاعدے اور قانون کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نجات کا مدار خدا کے رحم پر ہے۔

قرآن نے آکر اس تصور کی بھی تردید کی اور کہا کہ خدا نے' اپنی لا محدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود' ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور وہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس قدر اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (35/43)۔ قانون کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر بات (Cause and Effect) علت اور معلول کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ یعنی اگر فلاں کام کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا انجام یہ ہو گا۔ اس نے انسان کو یہ تمام قوانین بتا دیئے۔ اچھی طرح سمجھا دیئے۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس قانون پر عمل کرنے سے اس کا یہ فائدہ ہو گا اور اس کی خلاف ورزی سے اس کا یہ نقصان ہو گا۔ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اس سے کہہ دیا کہ اب تمہارا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کر لو اور جی چاہے تو اس کے خلاف چلے جاؤ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (76/3)۔ "ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب وہ چاہے اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے"۔ وہ صحیح راستہ اختیار کر لے گا تو اس سے اسی کا فائدہ ہو گا۔ ہمارا کچھ نہیں سنورے گا۔ غلط راستے پر چلے گا' تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ہمارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (2/286)۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کسی بات کو حکماً" اور جبراً" نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے مشورۃً" کہتا ہے۔ اس نے قرآن نازل کرنے کے بعد کہہ دیا کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18/29)۔ ان سے کہدو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے۔ جس

کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کے ماننے' نہ ماننے کا فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہو' اگر وہ صاحب عقل و ہوش ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے ایمان' اندھے یقین (Faith Blind) کا نام نہیں۔ یہ اس ذہنی اور قلبی اطمینان (Conviction) کا نام ہے جو انسان کو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (25/73)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود ان کے رب کی آیات بھی ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اعمال کے نتائج' قاعدے اور قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہوں' تو اس میں کسی کے فدیہ دے کر چھوٹ جانے یا سفارش سے رہا ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال لیں اور اس کے بعد ہزار روپیہ دیکر بھی چاہیں کہ جلنے کا درد آپ کی جگہ کسی اور کو ہو جائے تو یہ ناممکن ہو گا۔ اگر آپ سنکھیا کھا لیں تو چاہے آپ گورنر جنرل کی سفارش بھی کیوں نہ لے آئیں' آپ اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کریں جس کے مطابق' جلنے کے درد کو آرام اور سنکھیا کے مہلک اثرات سے حفاظت مل سکتی ہے۔ انسان کو تکلیف اور راحت' اس کے اعمال کے نتائج میں' خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے لِّیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ مَنْۢ بَیِّنَۃٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ مَنْۢ بَیِّنَۃٍ (8/42)۔ تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے ،، بھی دلیل و برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہے۔ نہ کوئی بے گناہ مستبد حاکم کے غصے اور جذبہ انتقام سے سزا پاتا ہے اور نہ ہی مجرم' فدیہ' کفارہ یا سفارش سے چھوٹ سکتا ہے۔ اسی لئے انسانوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ

نَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2/44)- ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا' نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی' نہ ہی کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا' نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا-

آپ نے غور کیا کہ "قانون والے خدا" کا تصور دے کر' قرآن کریم نے کس طرح مذہب کو سائنس بنا دیا؟ سائنس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس میں

(1) ہر سبب (Cause) اپنا ایک مقررہ نتیجہ (Effect) پیدا کرتا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا- اور

(2) سائنس' انکشاف حقیقت اس طرح کرتی ہے کہ اس پر کسی شخص کی خواہش' آرزو' مقصد' مفاد' جذبات کا کوئی اثر نہیں پڑتا- وہ ان باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی-

خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے' اس کی رو سے اعمال اپنے نتائج بھی اسی طریق سے مرتب کرتے ہیں اور حقائق کا اظہار بھی اسی طرح کیا گیا ہے- یہی وجہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا یہ پیغام "شاعری" نہیں- کالرج (Coleridge) نے ایک جگہ کہا ہے کہ شاعری کی ضد' نثر نہیں- سائنس ہے-

(The Anti-Thesis of Poetry is not Prose But Science)

قرآن' شاعری نہیں' سائنس ہے-

خدا اور انسان کے تعلق کے سلسلہ میں' قرآن کریم ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے- خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں- ان کے مطابق' ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہے اور کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھی چلی جا رہی ہے- انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین اسی طرح نافذالعمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی ست ہے اور انسانی عمر کا تقاضا ہے کہ اعمال کے

نتائج جلد سامنے آجائیں۔ اگر انسانی دست و بازو' قوانین خداوندی کو سہارا دیں اور ان کے بروئے کار آنے میں مدد کا موجب بنیں' تو ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے' انسان' مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں' خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ وہ تعلق ہے جس کے متعلق "مذاہب کی دنیا" میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔ (چونکہ اس نکتہ کے متعلق' میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی)۔

3- انسان اور کائنات کا تعلق

خدا اور انسان کے تعلق کے بعد' انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو فطرت کی قوتوں کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کے غضب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ اس کے ذہن میں آسکتا تھا۔ یعنی ان کے سامنے گڑگڑایا جائے اور ان سے رحم کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ اس دور کے انسان کی حالت یہ تھی کہ بادل گرجا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بجلی کڑکی' اور یہ سجدے میں گر گیا۔ سورج چمکا اور اس نے اسے نمسکار کر دیا۔ زلزلہ آیا اور یہ ڈنڈوت بجا لایا۔ بپھرا ہوا دریا سامنے آیا اور اس نے اسے ماتا کہہ دیا۔ شیر دھاڑا اور اس نے اسے دیوتا بنا لیا۔ ہندو مت انہی دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور انہی کی پرستش سکھاتا ہے۔ یجروید میں ہے۔

ہندو دھرم میں زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہو۔ جو سانپ دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے ہیں۔ انہیں بھی سجدہ ہو۔ جو سانپ ابھی اپنے بلوں میں ہیں انہیں بھی ہمارا سجدہ قبول ہو۔

یہ تو پھر بھی زندہ قوتیں تھیں۔ وہ ان غیر ذی حیات چیزوں کو بھی سجدے کرتے تھے جن سے انہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یجروید ہی میں دوسری جگہ ہے کہ حجامت بنواتے وقت یہ اشلوک پڑھنا چاہئے۔

اے استرے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارا سجدہ قبول ہو۔ تو اس کو بالکل تکلیف نہ پہنچائیو۔

اتھروید میں ہے۔

سردی والے بخار کو ہمارا سجدہ ہو۔ گرمی والے بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں۔ روزانہ' دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے (جس مذہب میں انسان اپنا مقام یہ سمجھے' اس میں شرف انسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اس نے اگر جھوٹ نہ بولو۔ سچ بولو' کہہ بھی دیا تو کیا اس سے کائنات کی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور انسانی معاملات (Human Problems) کا حل مل جائے گا؟

عیسائیت میں یہاں سے اتر کر دوسری طرف آیئے تو وہاں مادی کائنات اور اس کی آرائش و آسائش کی چیزوں کو یکسر قابل نفرت قرار دیا جاتا ہے' اور انسانی نجات کا راز ترک دنیا' ترک آرزو اور ترک لذات میں بتایا جاتا ہے۔ جتنا کوئی دنیا سے دور بھاگے' اتنا ہی وہ خدا کا مقرب ہو جاتا ہے۔ رہبانیت اور خانقاہیت کی تعلیم' عیسائیت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Saint Benedict) نے اسے ایک منظم ادارہ کی شکل دے کر تارک الدنیا راہبوں (Monks) اور راہبات (Nuns) کے غول کے غول پیدا کر دیئے۔ چنانچہ (Bucks) اپنی (Theological Dictionary) میں' مصر میں تحریک خانقاہیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا جنہوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے کرب و

اذیت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعے خدا اور عالم ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے۔

اس قسم کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا' وہی ہوا۔ چنانچہ (Buck) اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہو گئی۔ نیز انہوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔

ان تارک الدنیا زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آ رہی تھی۔

لپٹ لپٹ کر مانگنے والے بھکاری' راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچے میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بدمعاشی اور فریب وہی ان کا شعار تھا..... یہ لوگ مذہبی جوش عقیدت کے نقاب میں بدترین لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے۔

(Progress of Religious Ideas - Vol: 3. P.240)

جو لوگ اس قسم کی مذموم حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے' ان کی زندگی بھی عجیب و غریب انداز کی ہوتی تھی۔ عیسائیوں کے ہاں جو بڑے بڑے اولیاء (Saints) کا نام ملتا ہے ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی قسم کھا لیتا کہ میں عمر بھر غسل نہیں کروں گا۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں روحانی ترقی کا راز سمجھتا۔ کوئی ساری عمر اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ یہ تھا عیسائیت کی ترک دنیا کی تعلیم کا نتیجہ۔

قرآن کریم کی رو سے قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ تیرا مقام' فطرت کی قوتوں سے بہت بلند ہے۔ ان سب کو ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ تو ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ (اَللّٰهُ الَّذِیْ) سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (45/13)۔ اللہ وہ ہے جس نے' کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب تمہارے

لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ مقام آدم یہ ہے کہ تمام ملائکہ (فطرت کی قوتیں) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں نوع انسان کی نفع رسانیوں کے لئے صرف کرے۔ محسوس کائنات میں انسان سے اوپر صرف مقام خداوندی ہے جس کے قانون کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ' انسان سے برتر کوئی شے نہیں۔ دنیا کی زیبائش و آرائش کی چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انہیں کوئی قابل نفرت اور حرام قرار نہیں دے سکتا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7/32)۔ ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

آدمی کا یہ مقام اور انسان اور کائنات کا یہ تعلق' "دنیائے مذاہب" میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ وہاں یا تو مظاہر فطرت کے سامنے جھک جانا ہو گا' یا ان سے دور بھاگ جانا۔ انہیں مسخر کر کے تعمیر انسانیت کے کاموں میں صرف کرنا' صرف قرآن میں ملے گا۔

یاد رکھئے کہ قرآن کریم جب قوانین خداوندی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ان میں فطرت کے طبیعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں اور اخلاقی قوانین بھی۔ طبیعی قوانین کی اطاعت سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں۔ (We Obey Nature to Command it) اور اخلاقی قوانین کی اطاعت سے ہماری ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قوانین کی اطاعت' ہماری قوتوں میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔

ی شود از جبر پیدا اختیار

4- انسان اور انسان کا باہمی تعلق

ہندو دھرم میں انسان اور کائنات کے تعلق کے بعد' ہمارے سامنے

انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا سوال آتا ہے ہندو مت نے اس کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ برہمن' برہما کے سر سے پیدا ہوتے' کھشتری اس کے بازوؤں سے' ویش اس کی ٹانگوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے- یہ وہ ازلی تقسیم ہے جسے نہ دنیا کا کوئی نظام الٹ سکتا ہے اور نہ ہی انسان کی ذاتی کوششیں اس میں تغیر و تبدل کر سکتی ہیں- شودر کو ساری عمر اچھوت رہنا ہو گا- اس کا فریضہ' اونچی ذات کے ہندوؤں کی خدمت گزاری ہے- برہمن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ' پیدائش کے دن سے مرتے وقت تک' بلند ترین مدارج اور حقوق کا حامل ہوتا ہے- اس کے حقوق کی کیفیت یہ ہے کہ (رگ وید اور اتھروید کے حکم کے مطابق)

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں لیکن اگر براہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے کیونکہ براہمن ہی عورتوں کا مالک اور خاوند ہے- نہ کہ کھشتری یا ویش- (معراج انسانیت- صفحہ 81)

یہ تقسیم تھی بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کی- باقی رہے اس کے باہر کے انسان سو وہ انسان نہیں بلکہ ملیکش سمجھے جاتے تھے- آپ سوچئے کہ جس مذہب میں' خود اپنے اہل مذہب کو اس طرح ورنوں کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے' اور اس سے باہر کے انسانوں کو اس درجہ قابل نفرت و حقارت سمجھا جائے- اس میں جھوٹ نہ بولو اور چوری نہ کرو کا پرچار کیا اخلاقی اصلاح پیدا کر سکتا ہے؟

یہودیت میں یہودیوں کے ہاں' مذہب بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود تھا- کوئی شخص جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو' دین خداوندی کے اندر داخل کیا ہی نہیں جا سکتا تھا- جنت صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی- غیر بنی اسرائیل سب جہنم کا ایندھن تھے- اپنی نسل سے باہر کے انسانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکتے

رہتے تھے اور یہ سب (مروجہ) تورات کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاں' یہودیوں کے لئے قانون اور تھا اور غیر بنی اسرائیل کے لئے اور۔

عیسائیت میں عیسائیت کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر مذہب کی حیثیت رکھتی ہے اس میں' انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ چیز' عیسائیت کی تعلیم نہیں بلکہ بعد میں سیاسی مصلحتوں کا پیدا کردہ تصور ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں (جو اگرچہ وقتاً" فوقتاً" بدلتی رہتی ہے) ابھی تک یہ لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت یسوعؑ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

> انہیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی_ باب صفحہ 10 آیات 6-5)
>
> پاک چیز کتوں کو نہ دو۔ اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی_ باب 7 آیت 6)

یہ جو آپ یورپ میں نیشنلزم کی لعنت کو اس درجہ شدید دیکھتے ہیں' یہ غیر شعوری طور پر' اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مذہب کو تو انہوں نے گرجا کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دیا لیکن اس کی نسل پرستی کی تعلیم کے اثرات ان کے تحت الشعور میں اسی طرح موجود ہیں۔ ان کے سامنے عالمگیر انسانیت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول اور ہیں اور دوسری قوموں کے لئے اور۔ جس طرح رومنز کے ہاں یہ قانون تھا کہ کسی رومی کے ہاں چوری کرنا جرم ہے اور غیر رومی کے ہاں چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔[1]

قرآن کی رُو سے قرآن نے آکر' انسانوں کی ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑا اور اعلان کر دیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور

ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ انسان اور انسان میں پیدائش کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (4/1) خدا نے تم سب کو ایک جرثومہ حیات (Life Cell) سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً (10/19)۔ پوری کی پوری انسانیت (Mankind) ایک قوم ہے۔ اور ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70)۔ ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔ کالے کو گورے پر۔ گورے کو کالے پر۔ عربی کو عجمی پر' عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہاں نہ کوئی براہمن ہے نہ شودر۔ نہ کوئی جاتی اتر ہے نہ نیچ۔ سب انسان یکساں ہیں۔ باقی رہے معاشرہ میں ان کے مدارج' سو اس کا معیار ان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار پر ہے وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46/19)۔ "ہر ایک کے درجات ان کے اعمال کی رو سے متعین ہوں گے"۔ اور ان میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہو گا جس کی سیرت سب سے پاکیزہ اور کردار سب سے بلند ہو گا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49/13)۔ قرآن کا خدا' تمام نوع انسان کا یکساں رب' مالک' اور الٰہ ہے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (114/1-3)۔ اس خدا کی کتاب بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (45/21)۔ تمام نوع انسان کے لئے مجموعہ بصائر و حکم۔ اس کا رسول' تمام نوع انسان کے لئے یکساں رسول۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (7/158)۔ "ان سے کہہ دو کہ اے تمام دنیا کے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں"۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظریہ یا عمل کو حاصل ہو سکا ہے' جو بلا تفریق رنگ' نسل' زبان' وطن' مذہب' قومیت' تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہے وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13/17)۔ "زمین میں باقی وہی رہتا ہے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو" جیسا کہ پہلے

بھی کہا جا چکا ہے' مغربی تصور حیات نے بقائے اصلح (Survival of The Fittest) کا اصول دیا- یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو- قرآن نے اس کی بجائے "بقائے انفع" کا اصول دیا یعنی باقی وہ رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو- آپ نے غور کیا کہ اس ایک تصور حیات کے بدل جانے سے' انسانی زندگی کے تمام گوشے کس طرح بدل جاتے ہیں اور اس سے دنیائے انسانیت میں کس قدر حیات افروز اور حسن افزا تبدیلی آجاتی ہے؟ یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ میں دوسروں کی بہتری کے لئے کیوں کوشش کروں؟ حیات دوام حاصل کرنا' ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے- دنیا میں کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا- وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے- قرآن بتاتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو عالم انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہوں- دوسرے کی ضرورت شدید ہو' تو اسے اپنے آپ پر ترجیح دو- (يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9)- مومن وہ ہیں جو خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)- اور یہ سب کچھ بغیر کسی ذاتی غرض کے خیال سے کرو- وہ کہتا ہے کہ مومن جب دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9)- ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے- حتیٰ کہ تم سے شکریہ تک بھی نہیں چاہتے-

سوچئے کہ اس تصور حیات کی رو سے' اخلاقی اقدار کس طرح زندگی کا معمول بن جاتی ہیں!

انسانی مساوات کے تصور کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کا غلام ہونا تو ایک طرف' کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا- اور نہ ہی کسی کا محتاج- اس سے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جس میں تمام افراد' قوانین خداوندی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے معاملات باہمی مشاورت سے طے

کرتے ہیں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42/38)۔

قرآنی نظام یہ نظام ہر فرد کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیتا ہے کہ نحن نرزقکم و ایاھم (6/152)۔ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی"۔ کہئے !! اس نظام میں کسی کو جھوٹ بولنے یا چوری اور بددیانتی کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس میں اخلاقی اقدار خود بخود بروئے کار آتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظام میں نہ کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل ہوتے ہیں۔ نہ مذہبی پیشواؤں کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ ملوکیت نظر آسکتی ہے نہ سرمایہ داری۔ "دنیائے مذاہب" میں اس قسم کا نظام تو ایک طرف' سرے سے نظام کا تصور ہی نہیں ملتا۔

ختم نبوت نظام کے تصور سے' قرآن کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے جو "دنیائے مذاہب" میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے جن غیر متبدل اصولوں کی ضرورت تھی' وہ قرآن میں دیدیئے گئے اور ان کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں' ہر آنے والی نسل' اپنے معاملات' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' خود حل کرے گی۔ اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا باب نبوت کو بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ ختم نبوت' دنیائے مذاہب میں کتنے عظیم انقلاب کا اعلان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اب ذہن انسانی' اپنے عہد طفولیت سے نکل کر اس شعور میں پہنچ گیا ہے۔ انسان اب بچہ نہیں رہا' بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اسے کسی "آکر اٹھانے والے" کی احتیاج نہیں رہی۔ اسے اب خود اٹھنا اور آگے چلنا ہو گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے انسان میں کس قدر خود اعتمادی (Self-Confidence) پیدا ہوتی ہے اور وہ کس طرح دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے !۔

دنیا کا ہر مذہب' کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے جو آکر اس مذہب کو دوسرے مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔ قرآن نے اس تصور کی تردید کر کے کہہ دیا کہ ہم نے جو نظام زندگی تمہیں دیا ہے اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دنیا کے تمام نظامہائے زندگی پر غالب آجائے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (9/33)۔ تم اس نظام کو عملاً منشکل کرو۔ یہ انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ اس کے سامنے کوئی دوسرا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔

قرآن' اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظام زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے جس میں اخلاقی اقدار خود بخود غالب آجاتی ہیں۔

5- انسانی زندگی کا منتہیٰ (نجات)

اس کے بعد' آپ اس سوال کی طرف آیئے جو اس بحث میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصود و منتہی کیا ہے؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے اور اس سے بہت سے متعلقہ گوشے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

ہندو دھرم میں دنیا کے تمام مذاہب میں' انسانی زندگی کی تمام سعی و کاوش کے منتہی کو ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور وہ لفظ ہے "نجات"--- انگریزی (Salvation)۔ نجات سے مفہوم کیا ہے' یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو اسے نجات کہتے ہیں۔ یعنی نجات کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخص پہلے کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ مذہب کی دنیا میں انسان کے متعلق یہی بنیادی تصور ہے۔ ہندو مت (دھرم۔ یعنی

شریعت) میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات (جاندار' خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں' یا حیوانات اور انسان) اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص موجودہ جنم میں انسان ہے۔ اس نے برے کام کئے تو وہ اگلے جنم میں چوہا بن جائے گا۔ چوہے کو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ کس جرم کی پاداش میں چوہا بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ چوہا نیک کام کرے گا------ چوہا نیک کام کرے گا؟ گویا جانور بھی نیک کام اور برے کام کرتے ہیں !!_____ تو وہ آئندہ جنم میں (شاید) پھر انسان بن جائے۔ ہر انسان اس آواگون (Transmigration) کے چکر میں پھنسا ہوا ہے' اس چکر سے چھٹکارا مل جانے کا نام نجات ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ عقیدہ یا تو توہم پرستی کی پیداوار ہے اور یا ان لوگوں کے ذہن رسا کی تخلیق جنہوں نے کسی نہ کسی طرح معاشرہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے بعد چاہا کہ وہ اقتدار انہی کے گھرانوں میں مخصوص رہے۔ اور دوسرے لوگ اس اقتدار کے حصول کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ براہمن اور کھشتری حکمران طبقے تھے اور ویش اور شودر ان کے خدمت گزار۔ ہو سکتا تھا کہ کبھی کسی ویش یا شودر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ براہمنوں اور کھشتریوں کے بچوں کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی حکمران بن جائیں اور ہم ان کی غلامی کرتے رہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ براہمن کے گھر میں پیدا ہی وہ ہوتا ہے جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے ہوں اور ویش اور شودر کے ہاں وہی پیدا ہوتا ہے جس نے سابقہ جنم میں برے کام کئے ہوں۔ لہٰذا یہ تقسیم اعمال کے نتائج کے اعتبار سے عمل میں آتی ہے۔ یونہی دھاندلی سے پیدا نہیں کر دی گئی۔ انہیں اس زندگی میں بہرحال ویش اور شودر رہنا ہو گا۔ البتہ اگر وہ اچھے کام کریں گے (یعنی اتم جاتی کے لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے) تو اگلے جنم میں براہمن اور کھشتری بن جائیں گے۔ اس عقیدے کی رو سے محکوم طبقات کو مطمئن کر دیا

گیا کہ یہ سب ان کے اپنے کئے کا پھل ہے۔ ان پر ظلم نہیں ہو رہا۔ نہ ہی وہ اس جنم میں اس تقسیم کو بدل سکتے ہیں۔

اس عقیدہ کا جذبہ محرکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو' اس کا نتیجہ جس قدر انسانیت سوز ہے وہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس سے انسان مجبور محض ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ جی میں آئے کر لے' اپنی موجودہ پوزیشن میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا اور معاشرہ ایسے مستقل طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے جنہیں مٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ' اس تمام تگ و تاز سے بالاخر مقصد کیا ہے؟ یہ کہ انسان اواگون کے اس چکر سے نجات حاصل کر لے۔ انسانی تخلیق اور نظام کائنات کا یہ مقصد کس قدر بے معنی ہے؟

ویدانت کی رو سے ہندو ویدانت (طریقت یا تصوف) کی رو سے' انسان کی روح (آتما)' خدا (پرماتما) کی روح کا حصہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر' مادی دلدل میں پھنس چکی ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے مصروف آہ و فغاں ہے۔ مولانا روم کے الفاظ میں' جو ای ویدانتی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے :

بشنو از نے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ روح' مادی دلدل سے نجات حاصل کر کے' اپنی اصل سے جا ملے۔ یعنی غالب کے الفاظ میں----- عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا----- ترک دنیا' سنیاس' اس کا طریقہ ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رو سے' انسانی تگ و تاز کا ماحصل کیا ہے؟ فنا مکمل فنا (Complete Annihilation) یعنی خدا نے انسانی روح کو اپنے سے الگ کر کے' اسے مادی دلدل میں پھنسا دیا اور اس سے کہہ دیا کہ اب تم مشقتیں اٹھاؤ اور مصیبتیں جھیلو تاکہ تم اس دلدل سے نجات حاصل کر سکو۔ آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کی رو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور

اخلاقی اقدار کی پابندی کے لئے جذبہ محرکہ کیا بنتا ہے؟

یہودیت میں یہودیت میں بھی انسانی زندگی کا منتہی "نجات" ہے لیکن وہاں نجات کا تصور کچھ مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' یہودیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں اس لئے وہی جنت کے واحد وارث ہیں۔ جو انسان بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوا' وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس زمانہ میں بنی اسرائیل ہی میں ختنے کا رواج تھا اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ مختون سب جنت میں جائیں گے اور غیر مختون جہنم میں۔ چنانچہ تالمود میں ہے۔

> آخرت میں حضرت ابراہیمؑ جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کی ختنہ کی کھال اتار کر جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے' اس قسم کے اسرائیلیوں کے ختنے کے مقام پر چپکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر (چند دنوں کے لئے جہنم میں بھیج دیں گے۔ (تالمود صفحہ 404 بحوالہ برق طور صفحہ 166)

لیکن ان کا جہنم میں داخلہ محض رسم (Formality) پوری کرنے کے لئے ہو گا'۔ جہنم کی آگ ان پر کچھ اثر نہیں کرے گی۔ (ایضاً" صفحہ 405) اس کی وجہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے کہ

> اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکے گی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازے پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ (583)

اخروی نجات ہی نہیں' بلکہ اس دنیا میں عزت و سرفرازی کے لئے بھی یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ۔

بعض کو عزت ان کے آباء و اجداد کے اعمال حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں کے اعمال کے صدقے میں۔ (جیوئش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ششم صفحہ 60)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ

یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آبا واجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جد امجد ہیں۔

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ اینتھکس میں مذکور ہے کہ

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصے میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد 11_ صفحہ 144)

آپ غور فرمائے کہ ان عقائد کی موجودگی میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا کوئی سوال بھی پیدا ہوتا ہے؟

عیسائیوں میں عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ' اپنے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان سے ان گناہوں کی آلائش کا دور ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے خدا نے انسانوں پر رحم کھایا اور اپنے اکلوتے بیٹے (یسوع مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا کہ وہ صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے اس کفارہ پر ایمان لائیں گے' ان کی نجات ہو جائے گی۔ جو ایمان نہیں لائیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ نجات کے لئے اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ سینٹ پال' افسیون کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیون 2/8-9)

اور رومیوں کے نام خط میں ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کے بغیر' ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ (3/28)

گلتیون کے نام ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں... مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا (معاذ اللہ) اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔ (گلتیون 3/10-14)

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کے بعد' اخلاقی اعمال کی کہیں گنجائش بھی رہتی ہے۔ بلکہ اس کی رو سے' جو شخص اعمال پر بھروسہ کرتا ہے وہ لعنتی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے اس عقیدہ کی رو سے' انسان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے وہ اس کے اپنے کسی جرم کا نتیجہ نہیں' بلکہ اس کے اولیں ماں باپ کے گناہوں کی پاداش ہے جس میں یہ بیچارہ مفت میں ماخوذ کر دیا گیا ہے اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارا' کسی حسن عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا' بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان سے ملتا ہے۔ باقی رہا "ازلی گناہ" کے عقیدہ کا باطل ہونا' سو اس کے متعلق اب خود عیسائی دنیا کے ارباب فکر و تحقیق' اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔ مثلاً (R.F. Johnson) اپنی کتاب (Confucianism and Modern China) میں لکھتا ہے کہ

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے جس کی وجہ سے ہم

ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

مسٹر (A.E. Taylor) لکھتا ہے۔

یہ عقیدہ ایک بطلان ہے۔ میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرت انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچا لے۔

(Mind _ July 1912)

قرآن کی رُو سے "یہ سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والا مذہب" اسلام ہے جس نے اعلان کر دیا کہ کوئی انسان' نہ اپنی سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنے اولیں ماں باپ کی لغزشوں کی آلائش سے ملوث ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر انسانی بچہ سادہ لوح (Clean Slate) لے کر آتا ہے اور واجب التکریم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر' حیوانی سطح کی طبیعی زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بطور امکانات (Realisable Possibilities) رکھ دی گئی ہیں ان صلاحیتوں (Potentialities) کی نشوونما (Development) انسانی زندگی کا مقصود ہے اگر انسان صرف اپنی طبیعی زندگی (Physical Life) کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے تو اسے طبیعی دنیا کی آسائشیں اور قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اسے انسانی سطح کی بلند زندگی نصیب نہیں ہوتی" جسے قرآن جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (17/18)- جو صرف دنیاوی زندگی کا مفاد عاجلہ چاہتا ہے' اسے ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق' جسے ہم نے اپنے ارادے سے بنایا ہے' بہ عجلت دیدیتے ہیں۔ لیکن اس کی (انسانی) زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے جسے وہ ذلت و خواری میں بسر کرتا ہے۔ لیکن جو شخص طبیعی زندگی کے ساتھ' اپنی انسانی زندگی کی نشوونما بھی کرتا ہے اسے طبیعی

مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ذات میں بھی بالیدگی اور ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا" (17/19)- اور جو مستقبل کی خوشگواریاں چاہتا ہے اور اس کیلئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسی کرنی چاہئے' اور وہ خدا کی متعین کردہ بلند اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھتا ہے' تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں- كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ- وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا" (17/20)- ہم اس گروہ کو بھی' اپنے قانون مشیت کے مطابق' بڑھاتے رہتے ہیں' اور اس گروہ کو بھی- اور ان کی سعی و عمل کے حساب سے انہیں اپنی بخشائشوں سے نوازتے ہیں- یاد رکھو! ہم نے اپنی ان نعمتوں پر بند نہیں لگا رکھے کہ کسی قوم کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیں اور کسی سے رعایت برت کر اس کے لئے یونہی دروازے کھول دیں-

هست ایں میکده و دعوت عام است این جا
قسمت باده باندازه جام است این جا

انسانی ذات کی یہ نشوونما اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے جو مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے- یہ نشوونما' اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے- نیک اعمال وہ جن سے انسانی ذات کو استحکام و بالیدگی ملتی ہے- برے وہ جن سے اسے ضعف پہنچتا ہے- ہر عمل کا نتیجہ' ساتھ کے ساتھ' انسانی ذات پر مرتب ہوتا رہتا ہے- یہی اس کا اعمالنامہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں' اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور جو ظہور نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجاتا ہے- جو انسانی ذات ایک خاص معیار کے مطابق نشوونما پا لے گی وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی---- اسے جنت اخروی کی زندگی کہتے ہیں- جو اس معیار پر پوری نہیں اترے گی اس کی نشوونما رک جائے گی---- یہ جہنم کی زندگی ہے- اسی کو قرآن نے پلڑے کے بھاری اور ہلکا ہونے سے تعبیر کیا ہے- وَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (101/6-9)- سو جس کا پلڑا بھاری ہو گا وہ مسرتوں کا جھولا جھولے گا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گا' وہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رو سے' مقصد زندگی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں' بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی مناسب نشوونما سے' ایک بلند مقام حاصل کرنا' اور موجودہ زندگی سے اعلیٰ و ارفع سطح زندگی پر پہنچ جانا ہے۔ اسے قرآن نے فوز اور فلاح کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی (Achievement) اور (Success) نہ کہ نجات (Salvation)- اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ اس تصور کے ماتحت اس سوال کا جواب کس حسن و خوبی سے مل جاتا ہے کہ میں اخلاقی اقدار کی پابندی کیوں کروں۔ اس سے میرا کیا فائدہ ہو گا اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان۔ یہی وہ طریق ہے جس سے انسان ان اقدار کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت (Rationally) کرتا اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند رہتا ہے۔

الدین تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن کریم چند اخلاقی اقدار ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام عطا کرتا ہے جو خدا۔ انسان۔ کائنات۔ قانون مکافات۔ اور مقصد و مال زندگی کے بنیادی تصورات پر استوار ہوتا ہے۔ اس پورے نظام کا نام الدین ہے اور اس کی عملی شکل کو الاسلام کہا گیا ہے۔ اخلاقی اقدار اسی نظام کے اندر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور علی وجہ البصیرت ممکن العمل بھی۔ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں جس میں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3/18)

یہ حقیقت ہے کہ الدین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

اس لئے مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ

الْخَاسِرِيْنَ (3/84)- جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے اس نظام کو قبول نہیں کیا جائے گا- اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کس قدر نقصان میں رہتا ہے-

اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا نظام کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کے مختلف اجزا کے نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب اس نظام کو بالکلیہ اختیار کیا جائے- نظام کی مثال' طبیب کے نسخے کی سی ہوتی ہے- نسخے کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے' جب آپ اسے پورے کا پورا' متعلقہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں- اگر آپ اس نسخے میں سے ایک دو دوائیاں لے کر انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو وہ آپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں دیں گی- بلکہ ہو سکتا ہے کہ نقصان ہی دے دیں- اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ- فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ..... (2/85)

"کیا تم اس ضابطہ قوانین کے ایک حصہ کو ماننا چاہتے ہو اور ایک حصے سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اس کے لئے اس دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو- اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں" اس نسخہ کے اجزائے ترکیبی' وہ تمام صفات خداوندی ہیں جنہیں قرآن الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارتا ہے- ان میں سے بعض اجزاء کو لے لینا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دینا' کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا- یاد رکھئے- حقیقت (Reality) ایک ناقابل تقسیم وحدت (Indivisible Whole) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے- خدا کے الاسماء الحسنیٰ حقیقت مطلق کے مختلف پہلو (Facets) ہیں- حقیقت ان تمام کے مجموعے کا نام ہے- ان میں سے بعض کو الگ کر لیا جائے تو وہ اس

حقیقت کے اجزاء نہیں قرار پا سکتے۔ مثلاً اگر حقیقت کے سو گوشے ہیں اور ان میں سے آپ دس گوشے الگ کر لیتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے حقیقت کے 1/10 حصہ کو اختیار کر لیا ہے' اس لیے آپ کو اسی تناسب سے وہ فائدہ ہو جائے گا جو پوری حقیقت کے اختیار کرنے سے ہوتا۔ آپ نسخے کی دس دوائیوں میں سے ایک دوائی کھا کر دسواں حصہ شفا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ۔ (7/180)۔

"اور اللہ کے لئے الاسماء الحسنٰی ہیں (وہ اس حقیقت کلی کے مختلف گوشے ہیں) سو اسے ان تمام گوشوں کے ساتھ پکارو۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ان اسماء (صفات) میں سے (بعض کو لے کر) ایک طرف نکل جاتے ہیں"۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلامی نظام زندگی سے الگ رہتے ہیں ان کے ہاں جن اخلاقی اقدار پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے وہ وہی ہوتی ہیں جن کا تعلق انسان کے نرم و نازک جذبات سے ہوتا ہے۔ ہمدردی۔ رحم۔ عفو۔ درگذر۔ منکسر المزاجی۔ نرم خوئی۔ کوئی دس گالیاں بھی دے جائے تو خاموش رہو۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے' اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو تمہارا کوٹ اتارے اسے صدری اتار کر خود دے دو۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ یا ذرا آگے بڑھو تو چڑیوں' کوؤں کو دانہ ڈالو۔ مویشیوں کے لئے پیاؤ بنا دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ عدل' ظلم کی روک تھام' سلب و نہب (Exploitation) کا انسداد۔ عالمگیر انسانیت کے حقوق کا تحفظ۔ ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی کسی کا محکوم نہ ہو۔ ایسا معاشرتی نظم و نسق جس کی بنیاد احترام آدمیت پر ہو۔ ایسا معاشی دستور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر ایک کی ضروریات زندگی بلا مشقت و ذلت پوری ہوتی رہیں۔ ایسا عمرانی آئین جس کی رو سے ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرتا چلا جائے۔ ان باتوں کی ان کے ہاں کوئی اخلاقی

اہمیت نہیں ہو گی۔

عیسائیت کی تعلیم کا نتیجہ عیسائیت جو مذکورہ بالا قسم کی اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی علمبردار ہے' اس کے متعلق' ہسپانیہ کے نامور پروفیسر (Dr. Falta De Cracia) کے الفاظ میں سنئے جنہیں' برفو (Brifault) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) میں نقل کیا ہے' وہ لکھتا ہے۔

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں۔ لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں' جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو' دعوت دی ہے۔ اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں' رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ' وہ اخلاقی ضوابط کی معراج گہری ہے' عام انصاف اور دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس۔ جور واستبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان' آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو ان کی طرف فار قلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطہ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظام عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔ سینٹ و نسنٹ فرانس کے

اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے' اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجہ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں' انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بندھے رہیں' ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں' وہ مٹ جائیں۔ فنا ہو جائیں' عیسائیت کی روح انہیں جا کر تسلی دے گی۔ لیکن یہ اس کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہو گا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور' وہ ہمیشہ عفو' برداشت' رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی۔ لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خود داریوں کا ترک---- قدسیہ آرزو----- عدم مدافعت' خاموش اطاعت' ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا' غرضیکہ اس قسم کے متشدد (غیر فطری) ضابطہ اخلاق کا طوفان' عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔

(The Making of Humanity PP. 332-333)

لامذہبوں کی حالت یہ تو رہی مذہب پرست طبقہ کی اخلاقی اقدار کی کیفیت۔ اب ان لوگوں کو لیجئے جو نہ خدا کو مانتے ہیں' نہ انسانی ذات کی بقا

کو- نہ وحی کے قائل ہیں نہ حیات آخرت کے- اور اس کے باوجود اخلاقی اقدار کی تلقین کرتے ہیں- ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ (مثلاً) غریب کی مدد کرنی چاہئے' تو مجھے سمجھایئے کہ میں غریب کی مدد کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے اس کے عجیب و غریب قسم کے جوابات ملیں گے- کوئی کہے گا کہ یہ انسانی فریضہ ہے کہ ہم غریب کی مدد کریں- ان سے پوچھئے کہ صاحب ! انسانی فریضہ کا مطلب کیا ہے' اور وہ کون ہے جس نے مجھ پر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہو گا- کوئی کہے گا کہ ہمیں غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہئے کہ اگر ہم کل کو غریب ہو گئے تو دوسرا ہماری مدد بھی کرے- اول تو یہ معاوضہ (Reciprocity) کا جذبہ اس قدر پست ہے کہ اسے آپ کبھی بھی بلندی کردار سے تعبیر نہیں کر سکتے- پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ جو لوگ اس کا انتظام کر لیں کہ انہیں کسی کی مدد کی کبھی ضرورت نہ پڑے' انہیں آپ غریبوں کی مدد کے لئے کس طرح آمادہ کر سکیں گے؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی اپیل یکسر جذبات سے ہو گی- دلیل و برہان کی رو سے وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکیں گے اور یا' ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو ان کے تحت الشعور میں' یہ جذبات کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ ان باتوں کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے' اس لئے معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ کچھ کرنا چاہئے اور یا اس کے پیچھے سیاسی محرکات کار فرما ہوں گے- جیسے مشنریوں کے ہسپتال اور اسکول و کالجز' یا مہاتما گاندھی (آنجہانی) کی اہمسا- یا یہ نتیجہ ہو گا روایتی اور وراثتی عقائد کا اور یا انسان کے کمزور اعصاب کا جن کا نام نیک جذبات رکھ لیا جاتا ہے- آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی انسانی کردار کی بنیاد نہیں بن سکتی- باقی رہا نیشنل کیریکٹر' سو اس کے متعلق شروع میں عرض کیا جا چکا ہے- جذبات کے زور پر آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کوئی اچھا کام کروا سکتے ہیں- لیکن اس اچھے کام

کو اس کی زندگی کا معمول نہیں بنا سکتے۔ اس میں ثبات و دوام نہیں پیدا کر سکتے۔ اور کیریکٹر کہتے ہی اس نہج زندگی اور اسلوب حیات کو ہیں جس میں ثبات و دوام ہو۔ اس ثبات و دوام کا ضامن' صحیح تصور حیات پر ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور انہیں بھی جو کسی مذہب کو نہیں مانتے' زندگی کے ان تصورات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو اس کے نظام کے اصل و بنیاد ہیں وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ -(2/137)

اگر یہ لوگ ان تصورات پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو' تو پھر یہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں' تو پھر سمجھ لو کہ یہ صداقت و حقیقت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس راہ پر چل نہیں رہے۔

یہ ہیں برادران عزیز اسلام کی وہ خصوصیات جو نہ مذاہب عالم میں کہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی دنیائے فکر میں۔ اس لئے دین الحق اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

مسلمانوں کو انتباہ اس مقام پر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر کہ ہمارا دین تمام مذاہب سے افضل ہے' خوش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ہم بھی دنیا میں سب سے افضل قرار پا جاتے ہیں اور (اگر دنیا میں ہماری حالت اچھی نہیں تو اس کی چنداں پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اس کے بعد) آخرت میں جنت کے وارث ہمیں ہوں گے۔ باقی سب جہنم میں جائیں گے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے یہ بہت بڑی خود فریبی ہے جس میں ہم

مبتلا ہیں۔ (قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی کچھ یہودی بھی کہا کرتے تھے۔ اس سے ان کی جو حالت ہوئی وہ دنیا پر روشن ہے)۔ اسلام کا افضل ہونا ہمیں اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے خود افضل بن کر دکھائیں۔ خود ذلت و خوارمی کی زندگی بسر کرنا اور اسلام کی افضلیت پر ناز کرتے رہنا' حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دنیا بھر میں ڈھول پیٹتا پھرے کہ ہمارے ہاں ایک خاندانی نسخہ ہے جو اکسیر حیات ہے اور تمام بیماریوں کا مجرب علاج۔ اور خود اپنے سر درد کے لئے بھی دوسروں سے دوائی مانگتا پھرے۔ کہئے کہ ایسے شخص کو وہ نسخہ کیا فائدہ دے سکتا ہے اور اس کا اس پر فخر کرنا اس کے کس کام آسکتا ہے؟ اس سے تو اس کی الٹی جگ ہنسائی ہو گی اور کوئی شخص اس کے دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا۔ نسخہ کے مجرب ہونے کا اولین اور بنیادی ثبوت خود اس خاندان کی اپنی صحت ہو گی۔ اسلام نے اپنی صداقت اور فوقیت کا یہی ثبوت پیش کیا تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اس دین کے مخالفین سے کہا تھا کہ

يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ- فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ- اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6/136)

تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنے نظام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ عن قریب معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کی کامیابی آخر الامر کس کے حصے میں آتی ہے۔ اس طرح میرا یہ دعویٰ سچ بن کر سامنے آجائے گا کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور ایسا کہنے والے نے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنے دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر دیا۔ جب حضورؐ کے مخالفین نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ- اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10/16)

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں

سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

یاد رکھئے ! عزیزان من- دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں' اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کے خلاف کسی کو انگلی اٹھانے کی جرات نہ ہو- یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے-

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اب آخر میں' میں دو ایک ایسے شکوک کا ازالہ ضروری سمجھا ہوں جو اس ضمن میں اکثر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں- سب سے پہلے یہ کہ قرآن کریم دیگر اہل مذاہب سے کہتا ہے کہ میں مصدقا لما معکم ہوں- یعنی جو تعلیم تمہارے پاس ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں- سو جب قرآن کریم خود ان مذاہب کی تعلیم کو سچا تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے سچی تعلیم صرف قرآن کریم کے اندر ہے' دیگر اہل مذاہب کے پاس نہیں-

اعتراض واقعی وزنی ہے اور اس کا جواب نہایت ضروری- سب سے پہلے آپ یہ دیکھئے کہ کیا یہ مطالبہ کہ دیگر اہل مذاہب اس پر ایمان لائیں قرآن کریم کا مطالبہ ہے یا یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؟ مصدقا لما معکم والے ٹکڑے کی پوری آیت یوں ہے- یہود سے کہا جاتا ہے کہ

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ

(2/41)

"تم اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) جو مصدق ہے اس کا جو تمہارے پاس ہے- اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بنو" ! اس سے ظاہر ہے کہ قرآن خود اہل مذاہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں-

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ ان اہل مذاہب نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی تھی- لفظی تحریف بھی (4/71)- اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیئے تھے (2/79) اور حق کو باطل کے ساتھ مخلوط بھی کر دیا تھا (3/71)- اس طرح ان کتابوں میں بے شمار اختلافات پیدا ہو چکے تھے- (11/110)- قرآن کے ان دعاوی کی شہادت خود یہ اہل مذاہب دیتے ہیں- چنانچہ کوئی غیر مسلم بھی آج اس کا بدلائل دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں' وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی- اس اجمال کی تفصیل آپ کو میری کتاب' معراج انسانیت' کے باب اول میں ملے گی جس میں تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ خود ان مذاہب کے متبعین تحقیق کے مطابق بیان کی گئی ہے- اس سے ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو خود ان کے متبعین بھی حقیقی اور غیر محرف نہیں کہتے' قرآن کریم ان کی صداقت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے-

ان کتابوں میں' اس قدر تحریف و الحاق کے باوجود' کچھ اخلاقی اقدار موجود ہیں- قرآن کریم ان اقدار کی تصدیق کرتا ہے' نہ کہ پوری کی پوری کتابوں کی- اصل یہ ہے کہ یہاں مصدق کے معنی' "تصدیق کرنے والا" نہیں- اس کے معنی ہیں "سچ کر کے دکھانے والا"- قرآن کہتا یہ ہے کہ تمہارے پاس جو اخلاقی اقدار ہیں' وہ محض نظری حیثیت سے ہیں- میں وہ نظام دیتا ہوں جس میں یہ اقدار' سچی حقیقتیں بن کر سامنے آجائیں اور یہی میری خصوصیت ہے- مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ بھوکے کو روٹی کھلانی چاہئے' اور میں بھی یہی کہتا ہوں- تم اسے محض وعظ و نصیحت کے طور پر کہتے اور اور لوگوں کو خیرات دینے کی تلقین کرتے ہو- اس سے جس طرح لوگوں کی بھوک کا علاج ہوتا ہے' اسے ہر شخص جانتا ہے؟ میں ایک ایسا عملی نظام معیشت عطا کرتا ہوں جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا- اس طرح میں'

اس اخلاقی قدر کو سچ کر کے دکھا دیتا ہوں۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عملی نظام کی رو سے' یہ تمام اخلاقی قدریں سچ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہ چیز دین میں ممکن ہے۔ "مذہب" میں نہیں۔ اس لئے اسلام کو الدین کہا گیا ہے' مذہب نہیں کہا گیا۔ اس کا مقابلہ بھی دنیا کے دوسرے نظامہائے زندگی سے کرنا چاہئے' مذاہب سے نہیں۔

دوسرا شبہ دوسرا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں۔ یا (مثلاً) ایک شخص ہندوؤں کے گھر پیدا ہوتا ہے اور نہایت دیانتداری سے اپنے دھرم کو سچا سمجھ کر اس پر کاربند رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ ان پر فلاح و فوز کے دروازے بند کر دیئے جائیں یہ سوال بھی بہت سے قلوب کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

اگر نجات و سعادت یا جزا سزا کا معاملہ محض جذباتی ہوتا تو واقعی یہ بات قابل تسلیم ہوتی کہ جن لوگوں کا کچھ قصور نہیں انہیں سزا کیوں دی جائے۔ لیکن جب جزا سزا کا تعلق قانون سے ہو اور فوز و فلاح اعمال کے فطری نتائج کا نام تو اس میں جذبات کا دخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس گاؤں میں مدرسہ نہیں اس کے بچے ان پڑھ رہ جائیں گے اور جو فوائد پڑھے لکھے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں وہ ان سے محروم رہیں گے۔ یہ بہت بڑی سزا ہے جو ان بچوں کو مل رہی ہے' حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں آپ ان سے کتنی ہمدردی کیوں نہ کریں' علم سے بے بہرہ رہنے سے جو کمی ان میں آگئی ہے آپ کی ہمدردیاں اور رقیق جذبات اس کمی کو دور نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ جو بچہ بیماری کی وجہ سے سال بھر اسکول نہ جا سکے' آپ اسے اس بنا پر اگلی جماعت میں نہیں چڑھا دیتے کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اگلی جماعت میں اسے ہی چڑھایا جائے گا جس

میں اس جماعت میں چلنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہو گی- قرآن کی رو سے' زندگی کے اگلے مراحل میں وہی پہنچ سکے گا جس میں ان مراحل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو گی-

اسی اصول کا ان لوگوں پر بھی اطلاق ہو گا جو نہایت نیک نیتی سے مذہب کو صحیح سمجھ کر اس پر کاربند رہتے ہیں- جو شخص نہایت نیک نیتی سے سنکھیا کو دوائی سمجھ کر کھا لیتا ہے' سنکھیا یہ کہہ کر اپنا مضر اثر نہیں روک لے گا- کہ کھانے والے نے اسے نہایت نیک نیتی سے دوائی سمجھ کر کھایا تھا- سنکھیا اپنا اثر یکساں کرے گا- خواہ کسی نے اسے دیدہ دانستہ کھایا ہو یا غلطی سے- جو قوم آگ اور پانی (اگنی اور اندر) کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرتی رہے' وہ بھاپ کو اپنے کنٹرول میں لا کر انجن نہیں چلا سکتی- ظاہر ہے کہ ایسی قوم ان تمام فوائد سے محروم رہے گی جو بھاپ (Steam) کی قوت (Power) سے حاصل ہوتے ہیں- ان کی یہ محرومی' کسی کی طرف سے ملی ہوئی انتقامی سزا نہیں- ان کی جہالت کا فطری نتیجہ ہے جسے ہمدردی کے کوئی جذبات دور نہیں کر سکتے- یہ اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ وہ قوم قوانین خداوندی کی طرف رجوع کرے اور فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنے فائدے کے کام لے- قرآن کی رو سے' فلاح و فوز کے لئے یہی قانون مقرر ہے- اس میں نہ کسی کی آرزوؤں کا دخل ہے نہ جذبات کا تعلق- اس کا واضح اعلان ہے کہ

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ

-(4/123)

فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں کے مطابق- (فیصلہ ہمارے قانون کے مطابق ہو گا اور وہ قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط کام کرے گا' وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا-

اور قانون کو ہونا بھی ایسا ہی چاہئے- اگر قانون لوگوں کے جذبات کے

تابع چلنے لگے تو سلسلہ کائنات درہم برہم ہو جائے۔
لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (23/70)۔
اگر حق لوگوں کے خواہشات کے تابع چلنے لگے تو ارض و سموات اور جو کچھ ان کے اندر ہے' سب تہس نہس ہو جائے۔ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے' جو جذبات سے بلند ہو۔ اسی لئے' جو قومیں اپنے جرائم کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوتی ہیں' ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (91/14-15)۔ ان کے رب نے ان پر (قانون مکافات کا) (Road-Roller) بھیج دیا جس نے انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا اور ان کے انجام کے خیال سے خدا کے دل میں کوئی خوف اور ڈر پیدا نہ ہوا۔ وہ اس پر قطعاً" لرزاں و ترساں نہ ہوا۔ حتیٰ کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (44/29)۔ نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

لیکن یہ نہ سمجھتے کہ اس کے قانون میں توبہ اور باز آفرینی کی گنجائش ہی نہیں۔ جس سے کوئی ایک جرم سرزد ہو گیا وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ نہیں ! اس کے ہاں احساس ندامت کے بعد' اصلاح کا ہر وقت موقع ہوتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا"۔ (39/53)

"ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو ! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے' تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو وہ تمہاری تمام لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کر دے گا"۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے اچھے کام کرو جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو غلط روی سے تمہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11/115)۔ ناہمواریوں کے مضر اثرات کو حسن کارانہ زندگی کے اعمال ہی مٹا سکتے ہیں۔

ہماری ذمہ داری اب رہی آخری بات کہ جن لوگوں تک اسلام کا

پیغام نہیں پہنچ سکا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر ہے جو اس کتاب کی وراثت کے مدعی ہیں۔ ہم اگر اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہتے ہیں تو ان لوگوں کی غلط روی کا بار' جن تک ہم نے اسلام نہیں پہنچایا' ہماری گردن پر ہے۔ اسی کے لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ لَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ۔ (29/13)۔ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ بھی۔ اس وقت اقوام عالم' حق و صداقت کا نظام سامنے نہ ہونے کی وجہ سے' جس قدر انسانیت سوز جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں' ان کے عذاب کا ایک حصہ خود ہماری گردن پر بھی ہے اور یہ چیز ہماری حالت سے عیاں ہے۔ خدا نے ہمیں "شھداء علے الناس" بنایا تھا۔ یعنی تمام اقوام عالم کی نگرانی کا فریضہ ہمیں سونپا تھا۔ ہم' دوسروں کی نگرانی تو کجا' خود اپنی نگرانی کے بھی قابل نہ رہے۔ سو اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ جب کہیں چوری ہو' تو سو جانے والا چوکیدار سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔ سو ہم اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے' ہمیں اس عذاب سے قطعاً" نہیں بچا رہا۔ اور نہ ہی بچائے گا' جب تک ہم اس پر عمل کر کے خود اپنے آپ کو اس فوقیت کا مستحق نہ بنا لیں۔

آخر میں' میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس تقریر میں کہا ہے اس سے نہ کسی اہل مذہب کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ ہی ان کے بانیان مذاہب میں سے کسی کی (معاذ اللہ) تحقیر مطلوب۔ جہاں تک غیر مذاہب کے بانیوں کا تعلق ہے' قرآن کی رو سے ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا کی تمام اقوام کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور باقیوں کا نام لیکر ان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن کسی کا نام قرآن میں آیا ہے یا نہیں' ہم

ان تمام فرستادگان خداوندی کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں- یہاں تک کہ ان کی رسالت کا اقرار' ہمارا جزو ایمان ہے- قرآن کہتا یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے تو خدا کی سچی تعلیم پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں اس تعلیم میں کمی بیشی ہو گئی- اور اب وہ اصلی اور حقیقی تعلیم قرآن کریم کے اندر ہے- جب ہم اس حقیقت کو پیش کریں گے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے' تو اس کی تعلیم کے سامنے لامحالہ دوسرے مذاہب کی وہ تعلیم لانی پڑے گی جو قرآن کے خلاف ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک سچی نہیں ہو سکتی- میں نے غیر مذاہب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس مقصد کے پیش نظر کہا ہے- اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہئے کہ اسلام کسی کو برا کہہ کر اپنے آپ کو اچھا ثابت نہیں کرنا چاہتا وہ اپنی اچھائی کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا اور دلائل و براہین سے منواتا ہے- قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ تم مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو- وہ تمام دنیا کی واجب الاحترام ہستیوں کا احترام سکھاتا ہے البتہ ان کی' یا ان کی طرف منسوب کردہ' غلط تعلیم کو غلط قرار دیتا ہے- یہی شعار ہمارا بھی ہونا چاہئے-

والسلام

پرویز